ڈاکٹر نازیہ ملک

استاد،شعبہ اردو، نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد۔

دو پاکستانی جنگوں کے اردو افسانے پر اثرات

Dr. Nazia Malik

Assistant Professor, Department of Urdu,NUML, Islamabad.

The Two Wars of Pakistan and their Effects on Urdu Short Story

Soon after the creation of Pakistan, the political, social and economic problems faced by the country stayed almost the same even later. These problems eventually led the country to the wars of 1965 and 1971. These two wars shook the nation terribly. In the war of '65, the nation showed great enthusiasm, but towards '71 people went disappointed, melancholic and sad. These wars greatly influenced our poetry and prose, especially; the short story writers received deep impact and manifested their grief in their creative literature. They presented the subject of war in different ways. The paper under study, explores the effects of these wars on the short stories based on the theme of these two wars.

دراصل قیام پاکستان کے بعد سے ہی جس طرح کے پاکستان کو سیاسی سماجی اور معاشی سطح پر مسائل سے واسطہ پڑا وہ مسائل ہر دور میں جوں کے توں رہے اور پاکستان اب تک ان مسائل سے اپنا پیچھا نہیں چھڑا سکا۔دوسری طرف۱۹۶۵ءتک کے حالات نے جو مسائل پیدا کیے اس سے ابھی تک پاکستانی قوم سنبھل نہ سکی تھی اور جس آزادی کے لیے پاکستانی عوام نے اتنی قربانیاں دیں تھیں، تین عشرے گزرنے کے بعد بھی انھیں حاصل نہ ہو سکی۔۱۹۶۵ءاور۱۹۷۱ءکی جنگوں نے بھی پاکستانی عوام کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔۱۹۶۵ءکی جنگ میں پاکستانی عوام کا جذبہ برقرار تھا لیکن۱۹۷۱ءتک لوگوں کے دلوں میں مایوسی، قنوطیت اور افسردگی کے بادل گہرے ہو چکے تھے۔عوام میں ایک بیزاری کا جذبہ پایا جاتا تھا۔۱۹۶۵ءاور ۱۹۷۱ءکی جنگوں نے نئے مسائل کو

جنم دیا اور ہجرت کے مسائل دوبارہ پیدا ہوئے ا ور ملک کو اقتصادی حوالے سے بھی دھچکا لگا۔ سقوطِ ڈھاکہ نے ایک بار پھر قیامِ پاکستان کی یاد کو تازہ کر دیا۔ ۷۰ء کی دہائی کا آغاز حادثات سے ہوا۔ بقول ڈاکٹر فرمان فتح پوری:

> پاکستان کو دو نہایت اہم اور نازک موڑوں سے گزرنا پڑا۔ ایک کا تعلق ۱۹۶۵ء میں ہندوستانی حملے کے خلاف جنگ سے تھا اور دوسرے کا ۱۹۷۱ء میں سقوط ڈھاکہ کے المیہ سے دونوں کے عمل و ردعمل سے پیدا شدہ حالات و مسائل کا ذکر اس دور کی افسانہ نگاری سے ملتا ہے۔ دوسرا موڑ ہماری قومی غفلت، ناعاقبت اندیشی، سیاسی بے صبری خانماں بربادی، تباہی اور کرب و ندامت کے احساس کا پیکر بن کر ہمارے افسانوں میں رونما ہوا ہے۔[۱]

جس میں پہلا واقعہ ۱۹۶۵ء کی پاک بھارت جنگ جو سترہ روز تک قائم رہی۔ ایک بہت اہم واقعہ ہے۔ اس جنگ نے زندگی کے دوسرے شعبوں کے ساتھ ساتھ شعر و ادب پر بھی گہرے اثرات مرتب کیے۔ دوسرا اہم واقعہ سقوطِ ڈھاکہ کا المیہ ہے۔ بقول ڈاکٹر رشید امجد:

> ستمبر ۱۹۶۵ء پاکستانی قومیت کی شناخت میں ایک اہم موڑ ہے۔ اس جنگ نے پہلی بار زمین کی اہمیت محبت اور وطن پرستی کے جذبوں کو ایک نام دیا۔ ایک سمت اور ایک پہچان عطا کی۔ اس جنگ کے حوالے سے ہر شخص نے اپنی بساط کے مطابق اپنی وطن پرستی کا اظہار کیا اور افسانے میں پاکستان اور دفاع پاکستان ایک اہم موضوع بنا۔ ستمبر ۶۵ء کی جنگ معاہدہ تاشقند میں تبدیل ہوئی تو ایک بار پھر مجموعی مایوسی پھیل گئی اور وطن پرستی کا جو جذبہ پیدا ہوا تھا۔ بے سمت ہو گیا اس کا نتیجہ ۱۹۶۸ء کی عوامی تحریک کی صورت میں نکلا جس میں قائد اعظم کے بعد پہلی بار ایک قومی ہیرو ذوالفقار علی بھٹو کی شکل میں سامنے آیا۔ ۱۹۶۸ء کی تحریک عوامی نفرت کا اظہار تھا۔ جس نے مارشل لاء کے استبداد کو جڑوں سے ہلا دیا۔ لیکن ہمارے سیاستدانوں کی نااہلی اور بعض مفاد پرست طبقوں کی اجارہ داری نے اس تحریک کو ایک نئے مارشل لاء سے دو چار کر دیا جس کا نتیجہ ۱۹۷۱ء میں سقوط ڈھاکہ کے المیے کی صورت وقوع پذیر ہوا۔ سقوطِ ڈھاکہ نے مجموعی مایوسی کو اور گہرا کر دیا لیکن جمہوریت کے آغاز اور پہلی بار ایک متفقہ آئین نے چند ہی برسوں میں پرانے زخموں پر مرہم کاری کا عمل شروع کر دیا۔ اردو افسانہ باطن کی دنیا سے نکل کر حقیقت کی روشنی میں آیا لیکن اس ترقی کے ساتھ کہ اب ہماری کہانی ۱۹۳۶ء کی طرح محض خارجی حقیقت نگاری تک

محدود نہیں رہی بلکہ اس میں خارجی حقیقت نگاری کے ساتھ ساتھ باطنی دروں بینی کی دبازت بھی آ گئی۔[۲]

اردو افسانے کی تاریخ میں ۷۰ءکی دہائی کا افسانہ بہت اہمیت کا حامل ہے۔اس دور میں اردو ا فسانے نے بین الاقوامی مسائل۱۹۶۵ءکی جنگ سقوط ڈھاکہ کا حادثہ ہجرت قومی تشخص جیسے سوالات اور آمرانہ نظام کے خلاف مزاحمت جیسے موضوعات کو اپنے دامن میں سمیٹا۔

ستر کی دہائی میں اردو ادب کی اصناف میں افسانے کو پذیرائی ملی۔اس دور میں جو افسانہ نگار سامنے آئے ان میں انتظار حسین، خالدہ حسین، انور سجاد، رشید امجد، مسعود اشعر، منشا یاد، اعجاز راہی، احمد جاوید، سمیع آہوجا، مرزا حامد بیگ، فرخندہ لودھی، احمد داؤد، علی حیدر ملک، نشاط فاطمہ، یونس جاوید، رحمان شاہ عزیز، فریدہ حفیظ، منصور قیصر، محمود واحد، زاہدہ حنا، رخسانہ شوکت، نجم الحسن رضوی وغیرہ شامل ہیں۔

پروفیسر افتخار اجمل شاہین:

> جب جب دنیا میں کوئی اہم واقعات یا جنگیں ہوئیں، ان موضوعات پر بھی ہمارے افسانہ نگاروں نے افسانے لکھے۔۱۹۶۵ءاور ۱۹۷۱ءکی جنگ اور اس سے پیدا ہونے والے حالات پر ہمارے افسانہ نگاروں نے قلم اٹھایا.... انھوں نے اپنے قومی درد کو اپنی تخلیقات کی صورت میں پیش کیا۔مشرقی پاکستان میں جو درندگی کا کھیل کھیلا گیا اس کو یاد کر کے آج بھی ہم لرز اٹھتے ہیں لاکھوں اردو بولنے والے جن میں مغربی پاکستان کے لوگ اور ملازمین اور فوجی شامل تھے ان کا خون مکئی باہنی نے ہندوستانی نوجوانوں اور ہندوؤں کے ساتھ مل کر بے دریغ بہایا۔اس تلخی کو مشرقی پاکستان کے اردو افسانہ نگاروں نے زیادہ شدت سے محسوس کیا۔ان میں سے بہت سوں نے صرف ان واقعات کو اپنی آنکھوں سے دیکھا ہی نہیں تھا بلکہ ان مشکلات سے دوچار بھی ہوئے جو مشرقی پاکستان کے مکتی باہنی کی وجہ سے پیدا ہو گی تھیں۔پاکستان دشمن لوگوں نے وہاں کے مہاجروں اور وہاں رہنے والے پاکستانیوں کی زندگی اجیرن کر رکھی تھی۔مشرقی پاکستان کے ادیبوں نے ان المناک واقعات پر افسانے لکھے۔[۳]

ستر کی دہائی میں جو افسانہ نگار ہمارے سامنے آتے ہیں ان میں انتظار حسین، غلام ثقلین نقوی، رشید امجد، خدیجہ مستور، فرخندہ لودھی، صادق حسین، حجاب امتیاز علی، ممتاز مفتی، مشتاق قمر، عنایت اللہ، الطاف فاطمہ، مسعود مفتی، رشیدہ رضویہ، منیر احمد شیخ، علی حیدر ملک، تبسم یزدانی، انیس صدیق، شہناز پروین، محی الدین نواب، رحمن شریف، شہزاد منظر، مسعود اشعر، اختر جمال، زاہدہ حنا، آغا سہیل، ابراہیم جلیس، ام عمارہ،

غلام محمد، قیصر قیصری، احمد سعدی، رضیہ فصیح احمد، مشرف احمد، اے حمید وغیرہ شامل ہیں۔جنھوں نے ستر کی دہائی کے تمام عصری حالات افسانوں کے موضوعات میں سمو کر ہمیشہ کے لیے محفوظ کر لیے ہیں تاکہ آئندہ کے لیے ایسے حالات نہ پیدا ہوں جو ملک کو ابتری کی طرف لے جائیں۔

۱۹۶۵ءکی جنگ کے موضوعات جن افسانوں کا موضوع بنتے ہیں ان میں انتظار حسین کا 'سیکنڈ لاؤنڈ' حجاب امتیاز علی کا "موم بتی کے سامنے" ممتاز مفتی "پاکستان" غلام ثقلین نقوی کے افسانے نغمہ اور آگ، جلی مٹی کی خوشبو، اور سبز پوش، خدیجہ مستور کا "ٹھنڈا میٹھا پانی، "ثریا اور راستہ" فرخندہ لودھی "پاروتی" صادق حسین "ایک رات" مشتاق قمر کا مجموعہ "لہو اور مٹی" اور اس کے علاوہ الطاف فاطمہ، عنایت اللہ اور مسعود مفتی کا "مجموعہ نغمہ وآگ" کے افسانے شامل ہیں۔

۱۹۶۵ ءکی پاک بھارت جنگ کی وجہ سے پاکستانی اردو افسانے میں حب الوطنی، اور وطن سے محبت کے جذبات کا رجحان سامنے آیا۔جو وقتی طور پر ہنگامی نوعیت کا تھا جس نے پاکستانی افسانہ نگاروں کو ذہنی طور پر بہت متاثر کیا اور اس دور کے تمام افسانہ نگاروں نے جنگ کے موضوع کو مختلف حوالوں سے اپنے افسانوں کا حصہ بنایا۔بقول ڈاکٹر غلام حسین اظہر:

> ستمبر۱۹۶۵ءنے ہمیں خودشناسی کے جوہر سے بہرہ ور کیا۔ایثار اور حب الوطنی کے جذبہءخوابیدہ نے پھر سے انگڑائی لی اور تخلیق کے نئے سوتے پھوٹے۔ہمارے افسانہ نگاروں میں سب سے زیادہ غلام الثقلین نقوی نے اس جنگ کا اثر قبول کیا۔نقوی نے نغمہ اور آگ، جلی مٹی کی خوشبو اور سبز پوش جیسے شاہکار افسانے لکھے جن میں ہماری دھرتی کی بوباس موجود ہے۔(۴)

۱۹۶۵ءکی جنگ کے دوران سبز پوش کے وجود یا واہمے سے متعلق بھی بہت سی بحثیں چھڑی تھیں۔ اس حوالے سے غلام ثقلین نقوی نے اپنا افسانہ "سبز پوش" تحریر کیا تھا۔اس کہانی میں جذباتیت سے زیادہ کام لیا گیا ہے۔مگر مسلمان سپاہیوں کی بہادری کی بھی تعریف کی گئی ہے۔

اس نے آئینے میں اپنی صورت دیکھ لی تھی، وہ خود سبز پوش تھا اور اس کی پیشانی سے نور پھوٹ رہا تھا۔(۵)

اس افسانے میں دراصل غلام ثقلین نقوی نے یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ وطن کی حفاظت کی خاطر پاکستانی سپاہیوں میں جوش ولولہ بڑھ گیا تھا ایسا محسوس ہوتا تھا کہ جیسے کوئی طاقت یا سبز پوش بزرگ ان کی مدد کے لیے آن موجود ہوئے ہوں۔حالانکہ سبز پوش ےمافوق الفطرت عناصر ہماری استانوں کے زمانے کی باتیں ہیں۔یہاں سبز پوش سے مراد پاکستانی سپاہیوں کی حب الوطنی ہے جس نے انھیں وطن کی خاطر جان دینے سے بھی دریغ نہیں کرنے دیا۔

ان کے افسانے "جلی مٹی کی خوشبو" اور "نغمہ اور آگ" بھی اسی جنگ کے پس منظر میں لکھے گئے ہیں ان افسانوں میں بھی جذباتیت اور ہنگامی نوعیت کا رجحان سامنے آتا ہے۔ جس کی وجہ سے ان کے افسانوں کی فضا نسیم حجازی کے تاریخی ناولوں سے مماثل دکھائی دیتی ہے۔

اس نے بیلچے کی پہلی ضرب لگائی تو وطن مقدس کی سر زمین کانپ اٹھی، مسجد کے مینار کانپ اٹھے اور آسمان سے اترنے والی نور کی کرن کانپ اٹھی اور اندھی گپھا کا سایہ لرز گیا۔(۶)

خدیجہ مستور کا افسانہ "ٹھنڈا میٹھا پانی" میں کہانی کی مرکزی کردار ۵۶ءکی جنگ کا احوال بتا رہی ہے اور وہ بتاتی ہے کہ اس رات اچانک بھارت نے پاکستان پر حملہ کر دیا اور ملتان کی ایک بستی قاسم بیلہ پر بم باری شروع کر دی۔ کہانی کی اس مرکزی کردار کا تعلق بھی ملتان کے اسی علاقے سے تھا۔ اور وہ بڑی مشکل سے شوہر اور بچوں کے ساتھ جان بچا کر وہاں سے نکلتی ہے۔ آج بھی وہ ماضی کی انہی یادوں میں گم ہے اور جب بھی کسی گولے بارود کی آواز سنتی ہے تو اسے سترہ روزہ جنگ کے وہ دن یاد آجاتے ہیں۔

> مجھے امن سے محبت ہے۔ مجھے جنگ سے نفرت ہے۔ مگر مجھے اس جنگ سے بھی امن کی طرح محبت ہے جو انسان اپنی آزادی، اپنی عزت اور ملک کی بقا کے لیے لڑتا ہے۔ ہاں تو میں کہہ رہی تھی کہ جنگ ختم ہو گئی ہے مگر میں جب تک زندہ ہوں میری یادیں ختم نہ ہوں گی۔ اب میں آٹھ دس سال کے بچے کو کیسے بھولوں جو جنگ کے زمانے میں میرے قریب کے گھر کی چھت پر کھڑا پتنگ اڑا رہا تھا۔ اس دن اتنے جہاز اڑ رہے تھے کہ کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔ یہ معلوم ہوتے ہوئے بھی کہ یہ اپنے جہاز اڑ رہے ہیں میرا دل خوف ودہشت سے لرز رہا تھا۔(۷)

اس افسانے کے آخر میں مصنفہ نے اندھیرے میں بھی امید کی کرن جگانے کے لیے ایک پر امید بوڑھے کا ذکر کیا ہے۔ جو بم گرنے کی وجہ سے پڑنے والے ایک بڑے سے گڑھے کے پاس بیٹھا چندہ جمع کر رہا ہے کہ اس جگہ وہ ایک کنواں بنوائے گا جس کا پانی ٹھنڈا میٹھا ہو گا۔

> بم گرنے کی جگہ پر ایک چھوٹا سا کنواں بن گیا تھا اور اس کنویں کے قریب ایک بوڑھا شخص سفید چادر بچھائے ہوئے بیٹھا تھا۔ چادر پر بے شمار سکے پڑے ہوئے تھے۔ مجھے دیکھتے ہی بوڑھے نے آواز لگائی چندہ دو بیگم صاحب، اس جگہ کنواں کھدے گا اور یہاں سے ٹھنڈا میٹھا پانی نکلے گا۔(۸)

خدیجہ کے افسانے "ثریا" میں بھارت کی سرحد کے قریب کے ایک علاقے میں بسنے والے خاندانوں کی بربادی کی داستان رقم کی گئی ہے۔ اس افسانے کی مرکزی کردار ثریا ہے جو اپنے گھر والوں کے ساتھ جنگ

کے دنوں میں ہجرت کر کے لاہور آجاتی ہے اور یہاں آکر لوگوں کے گھروں میں کام کر کے گزارہ کرتی ہے مگر وہ اپنی انا اور خود داری کو محتاجی کی نذر نہیں ہونے دیتی۔اور جس گھر میں کام کرتی ہے اس کی مالکن کے اصرار پر اسے اپنے بارے میں بتاتی ہے۔

> جب برا وقت پڑا ہے تو چار چار فاقے کاٹے ہیں پر ثریا کی یہی ضد ہوتی ہے کہ کسی سے کچھ نہ مانگو چاہے مر جاؤ.... بی بی جی ہم لوگوں نے کبھی یہ مہتروں والا کام نہیں کیا تھا۔ ہمارے گاؤں میں اللہ کا دیا سب کچھ تھا۔اپنی بھینس تھی۔اپنا گھر تھا۔اپنی تھوڑی سی زمین بھی تھی جس پر ثریا کا ابا لہسن، پیاز اور سبزیاں بوتا۔پھر انہیں شہر بیچ آتا۔پیسے کی کمی نہ تھی.... پھر بی بی جی راتوں رات پتہ چلا کہ لڑائی ہو گئی۔ ہندوستان کی فوجیں آگئیں، بس جو ایک ایک جوڑا کپڑا تن پر تھا اسی حالت میں بھاگ کر لاہور آگئے۔ یہاں کب سے جھونپڑا ڈال کر پڑے ہیں۔ جب دوسری عورتوں نے مرتے دیکھا تو اس کام پر لگا دیا۔(۹)

خدیجہ کے افسانے "راستہ" میں سرحد پار بسنے والے دانشوروں کے انسانی جذبات کو ابھارنے کی کوشش کی گئی ہے۔اس افسانے کے شروع میں مرکزی کردار کو جنگ اور امن کے مسائل پر یوں سوچتے ہوئے دکھایا ہے کہ:

> اس نے فیصلہ کیا کہ وہ فوج میں بھرتی ہو جائے گا۔ایک دن تو وہ گھنٹوں یہ سوچ کر غصے اور خطرے سے لرزتا رہا تھا کہ پڑوسی ملک اس کے وطن کی سرحدوں پر فوجیں جمع کر رہا ہے۔اسے اپنے پڑوسی ملک کی بدمذاقی پر افسوس ہوا تھا۔کیا وہ ملک ویرانہ ہے؟ وہاں لوگ نہیں بستے؟ وہاں حسن جنم نہیں لیتا؟ جس ملک میں عورت بندیا لگاتی ہو، اس کے پاؤں میں بچھوا بجتا ہو، اور جہاں گنگا جمنا بہتی ہو، وہ جنگ کی باتیں کیسے کرتا ہے۔اس نے عہد کر لیا تھا کہ اگر اس کے ملک پر ذرا سی بھی آنچ آئی تو وہ اپنے خون کا آخری قطرہ تک بہا دے گا مگر اس محسور کن فضا میں زہر نہ گھلنے دے گا۔(۱۰)

اس افسانے میں دراصل مصنف نے یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ جنگ کے دنوں میں لوگوں کے احساسات وجذبات میں کس طرح تبدیلیاں آتی ہیں اور وہ اپنے ملک کی سالمیت اور بقا کی خاطر اپنی جان دینے سے بھی نہیں ڈرتے اور وطن کی عزت کی خاطر سب کچھ داؤ پر لگانے کو تیار ہو جاتے ہیں۔

مسعود مفتی کے مجموعہ "رگ سنگ" میں بھی بہت سے افسانے ایسے ہیں جو انھوں نے۱۹۶۵ءکی جنگ کے پس منظر میں لکھے ہیں۔ان افسانوں میں "سپاہی"، "نیا آدمی"، "دو خون"، "اپنے" وغیرہ اس ضمن میں نظر آتے ہیں۔

ان کے افسانے "سپاہی" میں افسانے کا مرکزی کردار نعیم جو چھ ستمبر کی جنگ میں شامل تھا اور اس نے یہ جنگ دشمن سے خود لڑی تھی اور آنکھوں دیکھے حالات وہ اپنے دوست کو سناتا ہے کہ کس طرح اس جنگ کے دوران اس نے ہولناک مناظر دیکھے تھے جو آج بھی اس کی آنکھوں کے سامنے سے نہیں ہٹے۔

> وہ ایک قیامت کا سماں تھا۔ ہمارے گرد دھواں، گرد اور گھن گرج، ہمارے اندر جوش، غصہ اور ہیجان، فرد کی ہستی عجیب طوفانی بھنور میں کہیں غائب ہو چکی تھی۔ اور ہم میں سے ہرایک اس وسیع منظر کا حصہ بن چکا تھا۔بندوقوں کی آواز ایسی تھی جیسے کوئی حصہ گڑ گڑا رہا ہو۔آگے اور پیچھے توپوں کے دھماکے تھے۔سامنے ٹینکوں کی یلغار تھی جو پل پر چڑھنا چاہتے تھے۔گولیاں بارش کی طرح گرتی تھیں۔جس منڈیر کے پیچھے ہم دبکے تھے۔اس پر گولیاں لگتیں تو مٹی کے فوارے ہمارے منہ، ناک اور آنکھوں میں گرتے۔ہم سب برداشت کر رہے تھے مگر جو چیز ناقابل برداشت تھی وہ سامنے آنے والے لوگ تھے۔ہمارے پاکستانی لوگ جن کے گھروں پر دشمن کا قبضہ ہو چکا تھا اور وہ پل اڑنے سے پہلے باٹا پور پہنچ جانا چاہتے تھے .... اور وہ لوگ گولیوں کی سیدھ میں بھاگے آتے تھے۔[۱۱]

مسعود مفتی کے افسانے "نیا آدمی" کا مرکزی کردار ایک چور شہابو ہے جو گائے بھینسوں کی چوری کر کے انھیں بیچتا ہے۔جنگ کے دنوں میں جب ریڈیو سے خبریں سنتا ہے اور بھارتی فوج کی اپنے علاقے میں آمد کا سنتا ہے تو اس کے تن بدن میں آگ لگ جاتی ہے۔اس کے اندر کا چور ختم ہو جاتا ہے اور ایک نیا آدمی اس کے اندر جنم لیتا ہے اور جو ہندو چھتریوں کے ذریعے اس کے علاقے میں اترتے ہیں وہ ان سے اپنے وطن کو بچانے کے لیے ایک سپاہی بن جاتا ہے جو اپنے ملک کی خاطر جان دے سکتا ہے تاکہ وہ ان دشمنوں سے اپنے ملک کو بچا سکے۔

ریڈیو پر اناؤنسر بڑے تحمل سے بولا:

> ہندوستان کئی علاقوں پر چھاپہ مار فوج اتار رہا ہے۔وہ لوگ کھیتوں اور سنسان علاقوں میں اتریں گے۔آپ کا فرض ہے کہ ان کو تباہ کریں اور گرفتار کریں۔شہابو کے جسم میں ایک دم چنگاریاں سلک اٹھیں۔اسے یوں لگا جیسے ہندوستانی علاقے میں کھڑے

ہوئے تینوں ہندو جاٹ سرحد پار نہ کر سکنے کے بعد اب ہوا سے چھتریوں کے ذریعے اترنا چاہتے ہیں۔ شرم اور غصے سے اس کے کان سرخ ہو گئے .... اوراس لمحے شہابو کے اندر ایک نیا آدمی پیدا ہونے لگا .... مگر اب یہ عادی مجرم غائب ہو رہا تھا، اس کی جگہ نیا آدمی اس کے دماغ میں کروٹیں لے رہا تھا۔[۱۲]

انتظار حسین کے افسانے "سیکنڈ راؤنڈ" میں بھی۱۹۶۵ءکی جنگ کو ہی پس منظربنایا گیا ہے جس میں سائرن، موت سے بچنے کے لیے بھاگتے ہوئے لوگ، سینر فائر، ریڈیو کے اعلانات وغیرہ کا بیان ہے۔اس افسانے میں جذباتی اور حب الوطنی کے جذبے سے سرشار کرداروں کا ذکر ہے لیکن اس افسانے کا تاثر پائیدار اور دائمی نظر نہیں آتا بلکہ وقتی اورہنگامی نظر آتا ہے۔

فرخندہ لودھی کا افسانہ "پاربتی" بھی ایسے ہی پس منظر کی ایک داستان ہے جس میں جنگ کے نتیجے میں جان بچا کر ایک عورت پاربتی پاکستان آ جاتی ہے اور یہاں ایک کرنل سے شادی کر لیتی ہے مگر جب کرنل کواس الغرض۱۹۶۵ءکی جنگ کے حوالے سے جتنے افسانے بھی تحریر کیے گئے ہیں ان میں زیادہ تر وقتی غم و غصہ اور جذباتی عناصر زیادہ پائے جاتے ہیں جبکہ کہانی کے لحاظ سے وہ افسانے کافی کمزور ہیں لیکن اس کے باوجود ہم کہہ سکتے ہیں کہ ان افسانوں نے اپنے عہد کے آشوب کو اپنے اندر سمیٹا اور اس عہد کے حالات کو ہمارے سامنے پیش کر دیا۔جس سے ہم اس وقت کے حالات کی تاریخ پر نظر دوڑا سکتے ہیں۔

اس کے بعد ہم مکتی باہنی اور فسادات کی تحریکوں اور سقوط ڈھاکہ کی وجوہات کے عوامل کے حوالے سے اردو افسانوں کا جائزہ لیں گے۔ہمارے بہت سے افسانہ نگار ایسے تھے جنھوں نے بنگال کا سانحہ ہونے سے پہلے حالات و واقعات سے اس بات کا اندازہ لگایا لیا تھا کہ حالات جو رخ اختیار کر رہے ہیں وہ کسی بڑے سانحے کے رونما ہونے کی پیشگوئی ہے اور مشرقی پاکستان کے ساتھ ہونے والی ناانصافیوں کو وہ اپنے حکمرانوں کی نااہلی اور غلطیاں قرار دیتے ہیں کہ جن کی وجہ سے دشمن ملک کو اپنی چال چلنے اور سازشیں کرنے کا موقع ملا۔

سقوط ڈھاکہ سے قبل کے حالات کے حوالے سے مسعود مفتی کا ایک افسانہ "باغی" بہت اہمیت کا حامل ہے۔یہ افسانہ مشرقی پاکستان سے علیحدگی سے قبل کے حالات پر مبنی ہے جب ۲۳ مارچ ۱۹۷۱ءکو بنگالیوں نے یوم پاکستان کے بجائے یوم مذمت منایا اور جگہ جگہ عمارتوں پربنگلہ دیش کا جھنڈا لہرایا تو اس کے نتیجے میں شہر میں جو جلسے جلوس نکلے یہ افسانہ ان واقعات کو بیان کرتا ہے۔

اور پھر ۲۳ مارچ کو پاکستان ڈے آتش فشاں پہاڑ کے لاوے کی طرح ابھرا۔سرحدی شہر کے بازاروں اور فٹ پاتھوں پر دھڑ دھڑ بنگلہ دیش کے جھنڈے بکنے لگے۔جسے دیکھو پیسے مٹھی میں دبائے بازار کو بھاگا چلا جا رہا ہے .... اور پھر خراما خراما سیڑھیاں،

منڈیر کود کر چھتوں پر بنگلہ دیش کے جھنڈے لگا رہا ہوتا۔ بلکہ بعض لوگوں نے تو مکان کے ہر کونے پر منڈیر اور برچی پر علیحدہ علیحدہ جھنڈا لگایا تاکہ ہر طرف سے نظر آئے۔(۱۳)

یوم مزاحمت کے حوالے سے مسعود مفتی کا افسانہ "سپنا" بھی قابل توجہ ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ یوم مذامت کے دن پر جب فوجی آپریشن کیا گیا تو اس میں بہت سے بے گناہ بنگالی بھی اس کا نشانہ بنے۔
پھر ۲۵ مارچ آ گیا رات کو پاکستانی فوج نے ایکشن شروع کیا اور بعد ازاں کئی دن تک پکڑ دھکڑ کا سلسلہ جاری رہا۔اس میں اس کا خاوند بھی پکڑا گیا۔
پھر؟ حفیظ نے دلچسپی سے پوچھا۔
پھر پیشتر اس کے کہ اسے پتا چلتا کہ اس کا خاوند پکڑا گیا ہے اسے دوسرے مشتبہ لوگوں کے ساتھ گولی ماردی گئی۔

مگر تم تو کہتے ہو کہ وہ مسلم لیگی اور پاکستانی تھا۔حفیظ نے حیرت سے پوچھا۔ تھا تو ....
مگر تم جانتے ہو ایسی کئی مثالیں موجود ہیں۔ غلطی سے یا غلط فہمی سے یا غلط مخبری سے، کئی بے گناہ لوگ مارے گئے تھے۔ان میں ایسے بھی تھے جو پاکستان کے حامی تھے۔(۱۴)

سقوط ڈھاکہ سے قبل کے حالات کے حوالے سے مسعود مفتی کا افسانہ "نیند" بھی خاص اہمیت کا حامل ہے۔اس کی کہانی یوں ہے کہ اس افسانے کا مرکزی کردار ایک پاکستانی ہے۔جس کے گھر کے باہر مشرقی پاکستان کے کچھ نوجوان جیتے بنگلہ دیش اور مجیب الرحمن زندہ باد کے نعرے لگا لگا کر اس کا سکون برباد کر دیتے ہیں اور وہ سکون سے سو بھی نہیں سکتا۔آخر کار وہ ان کے نعروں سے تنگ آ کر خود بھی ان ہی کی طرح نعرے لگانا شروع کر دیتا ہے۔جیئے بنگلہ بانگلہ اور جیئے مجیب الرحمن۔ایسا کرنے پر ہر وہ ایک عجیب مسائل کا شکار ہو جاتا ہے۔
مگر وہ پچیس مارچ کی رات تھی۔فوج باغیوں کی تلاش میں تھی۔ان کی مدافعت کے مرکزوں پر حملے کر رہی تھی اور شہر میں تابڑ توڑ گولیوں کی آواز آ رہی تھی .... اور وہ پانچ راتوں کے بعد سونے کی کوشش کر رہا تھا۔
رات کے پچھلے حصے میں پھر دستک ہوئی .... اس نے اندر سے زور سے نعرہ لگایا۔
"جیئے بنگلہ"
باہر فوجیوں کی پارٹی میں سب کے ابرو سمٹ گئے۔

پھر دستک ....

"جئے بنگلہ"

اب انچارج نے ذرا زور سے دروازہ کھٹکھٹایا اور پکارا۔

"دروازہ کھولو۔"

وہ آدھی نیند میں ڈوبا ہوا کچھ اندازہ نہ کر سکا۔

"نہیں کھولتا .... جئے بنگلہ .... جئے بنگلہ"

انچارج نے ایک فوجی کو اشارہ کیا۔اس نے مشین گن سے کھڑکی کا شیشہ توڑا اور بندوق کی نالی۔

اندر کر کے بھرپور فائر کھولا۔

وہ لمحہ بھر کو چارپائی پر اچھلا .... تڑپا .... اور پھر دائمی نیند سو گیا۔(۱۵)

۱۹۶۵ءکی جنگ کے دوران بھی بنگالیوں میں اس وقت عدم تحفظ کا احساس پیدا ہوا جب مشرقی پاکستان مغربی پاکستان سے دورہو گیا۔اور یہیں سے بنگالیوں کے دلوں میں مغربی پاکستان والوں کے لیے ایک نفرت کا احساس ابھرتا ہے۔اس کا اظہار ابراہیم جلیس نے اپنے افسانے "بانگلا دیش" میں یوں کیا:

> ۱۹۶۵ءکی جنگ تک تو صحیح کہا جا سکتا ہے کہ مشرقی اور مغربی پاکستان اسلام کے مضبوط رشتے میں بندھے ہوئے ہیں مگر۱۹۶۵ءکی جنگ کے بعد سے مغربی اور مشرقی پاکستان کے درمیان صرف ایک ہی راستہ باقی رہ گیا ہے اور وہ نازک رشتہ ہے پی آئی اے کا راستہ۔جس دن مشرقی اور مغربی پاکستان کے درمیان پی آئی اے کا رشتہ ٹوٹ جائے گا بس اسی دن سے خلیج بنگال مغربی اور مشرقی پاکستان کے درمیان خلیج اختلاف بن جائے گی۔(۱۶)

یہ درست ہے کہ قیام پاکستان کے بعد لسانی، معاشی، اقتصادی اور دفاعی حوالے سے بنگالیوں کو محروم رکھا گیا جس کی وجہ سے ان کے دلوں میں احساس محرومی پیدا ہوا اور وہ انتقام لینے پر مجبور ہو گئے۔

سقوط ڈھاکہ سے قبل کے حالات کے حوالے سے شہزاد منظر کا افسانہ "یوٹوپیا" خاص اہمیت کا حامل ہے۔اس افسانے میں سقوط ڈھاکہ سے قبل کے حالات کو اور اس حوالے سے چلائی جانے والی تحریکوں کو اس میں قلم بند کیا گیا ہے۔اس افسانے کے شروع میں ان حالات کا جائزہ لیا گیا ہے، جو سقوط ڈھاکہ کا پیش خیمہ ثابت ہوئے۔ان میں علیحدگی سے پہلے مشرقی پاکستان میں ہونے والی تحریکوں، ہنگاموں، لوٹ مار اور قتل وغارت کے واقعات کو دیکھایا گیا۔

اسی افسانے میں زبان کے مسئلے پر پیدا ہونے والے اختلافات کا ذکر کیا گیا ہے اور لوگوں کی تقسیم لسانی علاقائی اور معاشی مسئلوں کی بنیاد پر کی گئی اورملازمتوں میں بھی بنگالیوں کو مغربی پاکستانیوں پر ترجیح دی جانے لگی۔اس حوالے سے افسانے کا یہ حصہ دیکھیے:

> اس کی ملازمت کا ذکر آیا تو انھوں نے منہ لٹکاتے ہوئے بڑے معذرت طلب لہجے میں کہا۔ان دنوں ملازمت کی صورتحال بہت خراب ہے۔اور غیر بنگالیوں کی ملازمت کے سلسلے میں بڑی دشواریاں پیدا ہو گئی ہیں۔نیو اپوائنٹ منٹ کے سلسلے میں انھیں نہایت سختی کے ساتھ "سن آف دی سوائل" کی پالیسی پر عمل کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔(۱۷)

بنگالیوں اور مغربی پاکستانیوں کے دلوں میں نفرت کے حوالے سے انتظار حسین کا افسانہ "اندھی گلی" بھی خاص اہمیت رکھتا ہے۔اس افسانے میں انھوں نے تہذیب و ثقافت اور لسانی حوالے سے بنگالیوں اور غیر بنگالیوں کی نفرت کی وجوہات کا ذکر کیا ہے۔

> مسلمان ہونے کے باوجود ہمارے اور ان کے درمیان فاصلہ بہت تھا۔زبان کا فاصلہ، تہذیب کا فاصلہ، ہم نے اس فاصلے کو پاٹنے اور جاننے کی کوشش نہیں کی نہ انھوں نے ہمیں جانا نہ ہم نے انھیں پہچانا۔(۱۸)

یہ حقیقت تھی کہ ہندوستان سے ہجرت کر کے آنے والوں نے جب مشرقی پاکستان میں سکونت اختیار کی تو انھوں نے تہذیب و ثقافت اور زبان کے معاملے میں خود کو الگ رکھا۔جس کی وجہ سے دونوں کے دلوں میں ایک دوسرے کے لیے نفرت کا جذبہ بیدار ہوا۔

لسانی مسائل کے حوالے سے ایک اور افسانہ ا مِ عمارہ نے تحریر کیا جس کا عنوان "بہ گناہی بے گناہی" ہے۔اس افسانے میں ام عمارہ نے یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ مشرقی اور مغربی پاکستانیوں میں بہت جلدی یہ احساس بیدارہو گیا تھا کہ وہ تہذیبی اور لسانی حوالے سے ایک دوسرے سے بہت دورہیں اس لیے وہ جتنی بھی کوشش کر لیں وہ اس معاشرے کا نہ تو حصہ بن سکتے ہیں نہ یہاں کی زمین انھیں کسی صورت قبول کرے گی وہ یہاں ہمیشہ پردیسی ہی کہلائیں گے۔ان کے افسانے کا اقتباس دیکھیے:

> پھر کیا ہوا بابا! جب ہمیں یہیں رہنا ہے اور اسی مٹی میں مل جانا ہے۔تو پھر ہماری جڑیں اسی طرح یہاں مضبوط ہو سکتی ہیں۔بڑے بھیا نے بابا کی بات کاٹی، تم کہہ سکتے ہو بیٹے ورنہ میرا تجربہ تو یہ ہے کہ اس مٹی کا پیوند بن جانے سے بھی کوئی فرق نہیں پڑے گا اور پوند، پیوند ہی رہے گا۔(۱۹)

قیصر قصری نے بھی اپنے افسانے "تھوتھو" میں لسانی مسئلے پر سوال اٹھایا ہے۔وہ اس افسانے میں یہ بتانے کی کوشش کرتے ہیں کہ وہ لوگ جو ایک اللہ اور رسول، ایک کتاب اور ایک دیں کے ماننے والے ہیں وہ صرف اس بات پر تعصب کا شکار ہیں کہ ان کی زبان ایک دوسرے سے مختلف ہے۔کیا زبان مذہب اور باقی چیزوں پر اتنی فوقیت رکھتی ہے کہ اسے انا کا مسئلہ بنا لیا جائے۔

> میں نے تھوتھو سے کہا یہ جو پہلی سڑک بائیں ہاتھ کو جاتی ہے، اس پر چندر کو ناکے کارخانے ہیں اور اس سے آگے سیدھے سچے، نیک اور دین دار مسلمانوں کی بستیاں ہیں۔ان مسلمانوں نے کلمہ پڑھ پڑھ کر دوسرے مسلمانوں کا قتل کر دیا کیونکہ وہ دوسرے مسلمان ان کی زبان نہیں بولتے تھے۔تو بھی میری زبان نہیں سمجھتا۔کیا تو بڑا ہو کر مجھے قتل کرے گا تھوتھو؟(۲۰)

اسی طرح غلام محمد نے بھی اپنے افسانے "ترک وفا" میں زبان کے مسئلے کی سنگین نوعیت کو موضوع بنایا ہے۔اس کہانی میں ایک کردار کتوں کی خوبیوں کو بیان کرتا ہے اور کہتا ہے کہ کتے انسان سے بہتر ہیں کیونکہ نہ ان کی کوئی زبان ہوتی ہے اور نہ وہ زبان کے مسئلے پر جھگڑا کرتے ہیں۔اس افسانے کا ایک اقتباس ملاحظہ کیجیے:

> موچی نے کہا، کتوں کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ ان کے پاس زبان نہیں ہوتی ہے۔نوجوان نے دہرایا۔زبان نہیں ہوتی،یوں .... موچی نے کہا۔انھوں نے زبان کے مسئلے پر کبھی خون خرابہ نہیں کیا۔وہی اچھے رہے .... زبان کے نام پر جو نفرتیں ہوتی ہیں اور جو خون ریزیاں ہوتی ہیں ان میں کتے نہایت اچھے پائے گئے اور آدمی ان میں ملوث ہوئے۔(۲۱)

غلام محمد کا ایک اور افسانہ "تین مسافر" بھی لسانی اختلافات کے حوالے سے اہم ہے۔اس افسانے میں غلام محمد نے پاکستان کو ایک ریل گاڑی سے تشبیہ دی ہے۔جس کے مسافر ایک دوسرے سے ناراض ہیں۔اور ان کے دلوں میں ایک دوسرے کے خلاف سخت رنجشیں ہےں۔وہ ایک دوسرے کے قریب نہیں آنا چاہتے۔اس افسانے میں انھوں نے مشرقی پاکستان کو ریل کے ایک ایسے ڈبے سے تشبیہ دی ہے جس میں مسافروں کی تعداد سب سے زیادہ ہے اور اس میں مالی وسائل اور امداد کا سامان زیادہ ہے۔لیکن اس کے باوجود اس کے مسافر کھانے پینے کو ترستے ہیں۔اور ہر وقت ایک دوسرے سے لڑتے جھگڑتے رہتے ہیں۔اس افسانے کا اقتباس ملاحظہ کیجیے:

وہی سب سے بڑا ڈبہ تھا۔ اس میں کھانے پینے کا سامان موجود تھا مگر اسی ڈبے کے لوگ ایک ایک دانہ چاول اور ایک ایک قطرہ پانی کے لیے لڑ رہے تھے۔ اس ڈبے میں مسافروں کی تعداد حالانکہ تمام ڈبوں کے مقابلے میں زیادہ تھی۔ لوگ چھتوں پر بیٹھے ہوئے تھے اور دروازوں پر جھولتے تھے اور ایک مسافر دوسرے پر بل پڑتا تھا۔ اور اٹھتے بیٹھتے خون خرابہ ہوتا تھا مگر کبھی نہ انجن کے ڈائیور نے ان کا خیال کیا اور نہ کبھی گارڈ نے ان کی خستہ حالی پر توجہ دی۔[۲۲]

غلام محمد نے اپنے ایک اور افسانے "اداسی" میں، تہذیب و کلچر کو ایک نئے پہلو سے پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ جس میں انھوں نے مختلف علاقوں سے ہجرت کر کے بنگال آئے ہوئے لوگوں کا المیہ پیش کیا ہے۔

نہیں آذر۔ بات یہ ہے کہ ہم لوگ یو پی کے رہنے والے ہیں۔ کہاں بنگال۔ بھلا کیسے نبھے گی؟

کیوں؟

کلچر پر باتیں کرتے ہو۔ اتنا نہیں سوچتے کہ یوپی کا کلچر....

بس کیجیے رحمن صاحب۔ بس کیجیے۔ یہی احساس برتری آپ لوگوں کو تباہ کر کے چھوڑے گا۔

اینگلو انڈین وغیرہ بھی خود کو ہندوستانیوں کے مقابلے میں زیادہ مہذب تصور کرتے تھے۔ پر دیکھتے نہیں کہ آج کیا عالم ہے۔ نہ انگریز انھیں اپنا کہتے ہیں نہ ہندوستانی۔ آپ لوگ بھی یوں ہی رہ جائیے گا۔ کچھ دنوں بعد نہ یوپی آپ کو تسلیم کرے گی نہ مشرقی بنگال۔[۲۳]

لسانی مسائل کے حوالے سے شہزاد منظر کا افسانہ "اب ہم کہاں جائیں گے ماں" بہت اہمیت کا حامل ہے۔ اس افسانے کی مرکزی کردار قیام پاکستان کے وقت اپنا وطن چھوڑ کر مشرقی پاکستان آ جاتی ہے۔ یہاں بھی وہ غیر بنگالی ہونے کی وجہ سے خوف و حراس کا شکار رہتی ہے۔ لسانی حوالے سے جب فسادات ہوتے ہیں تو وہ زخمی ہو کر ہسپتال پہنچ جاتی ہے۔ اور جیسے ہی ہوش میں آتی ہے۔ فوراً اپنی ماں کے گلے سے لگ کر یہ سوال کرتی ہے کہاب ہم کہاں جائیں ماں۔ اس پر ماں جواب دیتی ہے۔

اس نے کہا عجب پاگل لڑکی ہے۔ اس میں رونے کی کیا بات ہے۔ یہ تو ہمارا مقدر تھا۔ ایک نہ ایک دن ایسا ہونا ہی تھا سو اس میں رونے کی کیا بات ہے۔ ہم سب تاریخی

جبریت کا شکار ہیں یا پاگل۔ ہمیں تو اس پر ہنسا چاہیے، ان حالات پر ہنسا چاہیے جن کے تحت ہم نے اپنا وطن چھوڑا اور اس خطہ امن کو اپنا وطن سمجھا۔ان لمحوں پر ہنسا چاہیے جب ابو نے اس سرزمین سے محبت کی۔اس کی زبان و تہذیب کو اپنایا۔ پھر بھی اس سرزمین نے انھیں قبول نہیں کیا۔(۲۴)

اختر جمال نے اپنے افسانے "دوسری ہجرت" میں اردو اور بنگلہ زبان کے لسانی تنازعے کو اس طرح بیان کیا ہے:

جگہ جگہ اردو اور بنگالی کی لڑائی اس طرح شروع ہو گئی جیسے کسی زمانے میں اردو اور ہندی کی لڑائی ہوا کرتی تھی۔ اردو اور ہندی بھی ایک ماں کی دو بیٹیاں تھیں مگر انگریز بہادر نے اپنی حکمت عملی سے انھیں ایک دوسرے کا دشمن بنا دیا تھا۔اور اب ان کے جانشین بنگلہ اور اردو کی لڑائی کا خاموشی سے تماشہ دیکھ رہے تھے۔(۲۵)

لسانی مسائل کے بعد جو افسانے زیر بحث آتے ہیں۔ان میں فسادات، قتل و غارت گری اور وحشت و بربریت کے واقعات نظر آتے ہیں۔۱۹۷۱ءکے آخری مہینوں میں مشرقی پاکستان میں ہر طرف لوٹ مار کا بازار گرم تھا فسادات اپنے عروج پر تھے۔اس حوالے سے انتظار حسین کا افسانہ "شہر افسوس" قابل ذکر ہے۔جس میں وہ فسادات کا نقشہ یوں کھینچتے ہیں۔

اسی طرح بھاگتے بھاگتے ایک نرالے نگر میں جا نکلا۔لاشیں دور دور تک نظر آ رہی تھیں۔ جیتا آدمی آس پاس کہیں نظر نہ آیا۔ میں حیران و پریشان ایک کوچے سے دوسرے کوچے میں اور ایک گلی سے نکل کر دوسری گلی میں گیا۔ بازار بند، رستے سنسان، گلیاں ویران،کسی کسی مکان کے بالائی دریچے کے پٹ اتنے کھلے کہ دو سہمی سہمی آنکھیں نظر آئیں اور پھر جلدی سے پٹ بند ہو جاتے۔عقل حیران تھی کہ کیسا نگر ہے۔لوگ گھروں میں مقید بیٹھے ہیں۔(۲۶)

اس کے علاوہ انتظار حسین نے اپنے افسانے "اسیر" اور "نیند" میں بھی فسادات کی ہولناکیوں کے مناظر کی عکاسی کی ہے۔

فسادات کے ہولناک واقعات کے حوالے سے ام عمارہ کے افسانے "کس نے کس کو اپنایا" میں وہ بے گناہ اور بے بس انسانوں کے خون بہانے کی داستان سناتی ہیں۔انسانوں کی بے بسی کی داستاں اس افسانے کے مرکزی کردار کی زبانی یوں بیان کرتی ہیں:

انسان انسان کا خون پی رہا تھا۔اور اس کی پیاس نہیں بجھ رہی تھی۔اس اتنی بڑی وسیع اور مہذب دنیا میں کوئی ایسا نہیں نظر آتا تھا جو ان خون چوسنے والے سانپوں کو بتا دیتا کہ آدمی پر آدمی کا خون حرام ہے۔اور یہ گناہِ کبیرہ ہے۔لیکن گناہ کیا ہے حرام کس کو کہتے ہیں اس کے بارے میں سوچنے اور دھیان دینے کے لیے نہ کسی کے پاس وقت تھا اور نہ فرصت۔(۲۶)

اس کے بعد افسانوں میں جو موضوع ہمارے سامنے آتا ہے اس کا تعلق ۱۹۷۱ءکی جنگ اور جنگ سے پیدا ہونے والے مسائل سے ہے۔اس حوالے سے مسعود اشعر کا افسانہ "اپنی اپنی سچائیاں" اہم ہے جس میں فوجی کارروائی کے دوران فوجیوں سے ہونے والے ظلم اور زیادتیوں کو بیان کیا گیا ہے۔اس افسانے کا اقتباس ملاحظہ کیجیے:

رات کو توپوں کی گھن گرج میں وہ آئے اور کہنے لگے اپنے مرد ہمارے حوالے کر دو سارے مرد ہمارے ساتھ آ جائیں۔میں نے کہا یہ میرا بیٹا تو مرد نہیں ہے۔بچہ ہے۔مگر انھوں نے میری طرف اس طرح دیکھا جیسے وہ میری بات نہیں سمجھے جیسے میری آواز ان کے کانوں تک پہنچی ہی نہیں۔

تم بھی یہاں سے کہیں نہیں جاؤ گی۔

میں یہاں سے کہاں جا سکتی ہوں! مگر تم لوگ یہ تو دیکھو ....

"ہم سب دیکھ لیں گے" انھوں نے ایک قہقہہ لگایا۔تم سامنے سے ہٹ جاؤ۔

میں سامنے ہٹ جانے کا مطلب نہیں سمجھتی تھی مگر جب وہ میری بیٹی کی طرف بڑھے تو میں ان کا مطلب سمجھ گئی اور آگے بڑھی، "یہ تو میری بیٹی ہے۔یہ تمہاری بیٹی ہے۔یہ تو مرد نہیں ہے۔

بیٹی۔کس کی بیٹی؟ ان کی آنکھیں سادہ کاغذ کی طرح بالکل سفید تھیں۔اور پھر زمین کی کوکھ ننگی ہو گئی۔میری بیٹی اپنے باپ اور بھائیوں کے سامنے ننگی ہو گئی۔انھوں نے اس کی ساڑھی پکڑ کر کھینچی اور وہ ساڑھی لمبی ہونے کے بجائے ان کے ہاتھوں میں لپٹ گئی۔(۲۷)

رضیہ فصیح احمد نے ایک افسانہ "پل" لکھا جس میں انھوں نے ۱۹۷۱ءکی جنگ کے واقعات کو موضوع بنایا۔اس افسانے میں انھوں نے متحدہ پاکستان کو ایک پل سے تشبیہ دی ہے جو کسی بھی وقت حالات کی خرابی کے باعث ٹوٹ سکتا ہے۔پل کو انھوں نے ایک علامت کے طور پر لیا ہے اور وہ اپنے علامتی انداز میں لکھتیں ہیں:

اچانک ایک دن خبر آئی کہ پل کے آدھے لوگوں نے ایک زبردست دروازہ لگا کر آدھے پل کو بالکل الگ کر لیا ہے۔اور اعلان کر دیا ہے کہ باقی پل کے ساتھ ان کا

کوئی واسطہ نہیں۔ جن لوگوں کو پل کے دوسرے حصے کا ہمدرد سمجھتے ہیں بلا تامل مار ڈالتے ہیں۔ انھوں نے اپنی حفاظت کے لیے بیرونی امداد بھی حاصل کر لی ہے۔ اور ان کے ساتھیوں نے سارے پل کی ناکہ بندی کر لی ہے۔[۲۸]

اختر جمال اپنے افسانے "دوسری ہجرت" میں ۱۹۷۱ء کی جنگ کا تذکرہ کرتے ہوئے بتاتے ہیں کہ جب ہتھیار ڈالنے کی خبر مغربی پاکستان پہنچتی ہے تو افسانے کی مرکزی کردار عائشہ سناٹے میں آ جاتی ہے اور اس کے جذبات بری طرح مجروح ہو جاتے ہیں کیونکہ عائشہ اس جنگ میں اپنے بچوں کو بھی محاذ پر لڑنے کے لےے بھیج دیتی ہے۔ جنگ بندی کا سن کر وہ سوچتی ہے کہ ہماری فوج نے جیتے جی کیوں ہتھیار ڈال دیے۔

جب ہتھیار ڈالنے کی خبر آئی تو عائشہ بت بنی رہ گئی۔ اسے ایسے لگا کہ جو گردن وہ اب تک اکڑائے کھڑی تھی وہ ٹوٹ گئی۔ درد کی لہر اس کی نس نس میں تیرنے لگی۔ اس نے سارا دن کچھ نہ کھایا نہ پیایا اس کا اپنے وجود کی بوجھل گٹھڑی پھینک دینے کو جی چاہا۔ وجود کا کتنا بوجھ ہے۔ یہ پہلی بار احساس ہوا۔ اس نے اَن گنت تاروں کو بے بسی سے دیکھ کر سوچا انسانوں کی تقدیر کا فیصلہ کیا سچ مچ ان ستاروں کا کھیل ہے۔[۲۹]

۱۹۷۱ء کی جنگ کے حوالے سے ڈاکٹر رشید امجد کا افسانہ "کہانی ایک زوال کی" بھی قابل ذکر ہے۔ اس افسانے میں وہ اس جنگ کو ایک سوچی سمجھی سازش کردار دیتے ہیں۔ اور ان کے افسانے کا مرکزی کردار اس کہانی میں خود کلامی کرتا ہوا کہتا ہے:

میں گلی کے نکڑ پر کھڑے تاریکی میں ڈوبے ہوئے شہر کو تلاش کرتا ہوں .... دھیرے دھیرے شہر کالی جھیل میں ڈوب رہا ہے۔ میں اندھیرے میں چھپے ان سانپوں کو تلاش کرتا ہوں۔ وہ میرے آس پاس موجود ہیں۔ میری تاریخ کے صفحوں کے گھونسلوں میں سے باہر نکلتے ہیں .... اے سانپو .... اے سانپو .... میری تاریخ .... اے مسجدوں کے شہر زندہ باد .... تو دلدل میں ڈوب رہا ہے۔ لیکن میں نے اپنی بندوق دانستہ نہیں پھینکی .... مجھے دھوکہ دیا گیا ہے۔[۳۰]

مسعود مفتی کا افسانہ "کفارہ" بھی جنگ کے حوالے سے ہے۔ اس افسانے کا مرکزی کردار جنگ میں حصہ لیتا ہے۔ اور شکست کھا کر جنگی قیدی بن جاتا ہے۔ قیدی بننے کے بعد کبھی اسے ندامت ہونے لگتی ہے کہ وہ شکست خوردہ ہے۔ تو کبھی وہ فخر محسوس کرنے لگتا ہے کہ اس نے جو بھی کیا وطن کی خاطر کیا۔ وہ عجیب طرح کی ذہنی کشمکش کا شکار ہو جاتا ہے۔

وہ جنگی قیدی تھا سب لوگ اسے تماشے کی طرح دیکھ رہے تھے۔ اس سے اسے خفت بھی ہو رہی تھی مگر ساتھ ہی وہ کبھی کبھی تن بھی جاتا کہ میں ملک کی خاطر گرفتار ہوا ہوں۔ خفت کیسی یہ تو فخر کی بات

ہے۔ مگر اگلے لمحے اسے خیال آتا کہ ہوں تو شکست خوردہ اسے اپنے پر ندامت ہونے لگتی۔ کبھی خفت کبھی فخر اور کبھی ندامت کے متضاد جذبوں میں لوٹ پوٹ ہوتا وہ لوگوں کی نظروں کا مقابلہ کرتا رہا۔[۳۱]

مسعود مفتی نے اپنے افسانے "جال" میں جنگ کے دنوں کے حالات بتاتے ہوئے لکھا:

> ہر شخص کی زندگی کا اگلا پل تقدیر کے گنجلک میں چھپا ہوا تھا .... سرشام ہی سڑکیں سنسان ہونے لگتی تھیں رات پڑتے ہی ہو کا عالم چھا جاتا تھا اور پھر چوراہوں پر ٹریفک کانسٹیبل کے بجائے خوف و ہراس کے سائے کھڑے ہو کر ہاتھ ہلانے لگتے تھے۔ جس طرح ہسپتال کی فضا میں مخصوص بُو رچی ہوتی ہے اسی طرح ڈھاکہ کی فضا میں ڈر، بے یقینی، درماندگی، بے دلی اور ویرانی کا ملا جلا طلسم چھایا ہوتا تھا۔[۳۲]

اپنے افسانے "الٹی قبر" میں بھی ابراہیم جلیس بنگلہ دیشیوں کے انہی حالات کی عکاسی کرتے ہیں۔

ادھر سالا ہم غریبوں کو ایک کھولی بنانے کو زمین بھی نہیں ملتا۔ صرف سالا دو گز زمین قبر کے لیے فری ملتا .... پھر بنگلہ دیش میں قاضی کبیر کو بڑا بنگلہ تو ادھر پاکستان میں قاضی بشیر کو بڑا بنگلہ۔[۳۳]

اس کے بعد افسانے میں جو بڑا موضوع نظر آتا ہے وہ ہجرت سے متعلق ہے۔ انتظار حسین اپنے افسانے "شہر افسوس" میں ہجرت کے حوالے سے ایسے لوگوں کا احوال بیان کیا ہے جنھیں ہجرت کے بعد بھی سکون نہیں ملتا اور وہ دوبارہ ہجرت پر مجبور ہو جاتے ہیں۔

جو لوگ اپنی زمین سے بچھڑ جاتے ہیں پھر کوئی زمین انھیں قبول نہیں کرتی۔ میں نے یہ دیکھا اور جانا کہ ہر زمین ظالم ہے۔

جو زمین جنم دیتی ہے وہ بھی؟

ہاں جو زمین جنم دیتی ہے وہ بھی۔

اور جو زمین دارلا اماں بنتی ہے وہ بھی۔ میں نے گیان کے نگر میں جنم لیا اور گیان کے اس بھکشو نے یہ جانا کہ دنیا میں دکھ ہی دکھ ہے۔ اور نروان کسی صورت میں نہیں ہے۔ اور ہر زمین ظالم ہے۔[۳۴]

علی حیدر ملک کا افسانہ "پسپائی کا آخری موڑ" ہجرت کے المیے کی نشاندہی کرتا ہے۔ یہ کہانی ایک ایسے انسان کی ہے جو قیام پاکستان کے وقت ہجرت کر کے مشرقی پاکستان آتا ہے لیکن یہاں کے لوگ اسے کسی صورت قبول کرنے پر تیار نہیں اور اسے دھکے دے کر یہاں سے نکال دیا جاتا ہے۔ یہ دراصل ایک علامتی افسانہ ہے۔ جس کا کردار علامتی انداز میں ہجرت کے موضوع کو بیان کرتا ہے۔

وہاں پہنچ کر میں نے سونے کے محل کی بنیاد رکھی اور اس کی تعمیر شروع کر دی جیسے جیسے محل کی دیواریں اونچی ہوتی گئیں اس کے نقش و نگار واضح ہوتے گئے۔ وہ میری کاریگری اور مہارت کے قائل ہوتے

گئے۔ برسوں کی لگاتار محنت کے بعد آخر کار وہ محل مکمل ہو گیا وہ سب بہت خوش ہوئے اور خوشی سے ناچنے اور گانے لگے۔ جشن کی محفل ختم ہوئی تو میں تھکن سے چور ہو کر وہیں محل کے ایک سائبان میں سوگیا۔ نہ جانے کب تک یوں ہی سوتا رہتا کہ معاً کسی نے جھنجھوڑ کر مجھے اٹھا دیا۔

ارے یہ یہاں کیوں سویا ہوا ہے۔ ہمارے محل پر قبضہ کرے گا کیا؟ سانولے رنگ کے ایک دبلے پتلے آدمی نے ہاتھ لہرا کر کہا۔

"نکالو نکالو .... اسے یہاں سے نکالو" بہت سی آوازیں کھلے خنجر کی طرح فضا میں لہرانے لگیں۔

"بہت تھک گیا ہوں۔ ذرا آرام کر لوں۔" میں نے دھیمے لہجے میں کہا۔

"نہیں نہیں" ہوا میں تیر سنسنانے لگے۔

میں نے بہت منت سماجت کی۔ ہاتھ پاؤں جوڑے۔ پاؤں پکڑے لیکن انھوں نے میری ایک بھی نہ سنی اور آنکھوں پر پٹی باندھ کر مجھے گھسیٹنے لگے۔ انھوں نے مجھے اتنا گھسیٹا اتنا گھسیٹا کہ میرا سارا وجود لہو میں تر ہو گیا۔(۳۵)

ہجرت کے حوالے سے مسعود اشعر نے اپنا افسانہ "دکھ جو مٹی نے دیے" لکھا۔ اس افسانے کا مرکزی کردار پہلی ہجرت کے بعد دوبارہ ہجرت کرتا ہے۔ اور اسے بار بار یہ احساس دلایا جاتا ہے کہ یہ زمین اس کی نہیں۔

اور جو کیڑا زمین کے ہم رنگ نہیں ہوتا۔

وہ ہمیشہ خطرے میں رہتا ہے پھر ایک قہقہہ پڑا۔

مگر ایسا کیڑا غیر محفوظ ہو تو وہ پناہ کہاں تلاش کرے؟ میں نے چلتے چلتے اپنے آپ سے سوال کیا لیکن میرا سوال انھوں نے بھی سن لیا تھا۔ اس لیے ان سب نے مل کر جواب دیا۔

'اپنی ماں کی گود میں'

اس جواب کے ساتھ ہی میرے پاؤں پھر زمین سے اکھڑ گئے تھے اور میں خلا میں بھٹکنے لگا تھا۔(۳۶)

اسی حوالے سے مشرف احمد کا افسانہ "خوشبو" بھی قابل ذکر ہے جو ایک مکالمے کے انداز میں لکھا گیا ہے۔ یہ افسانہ اپنے اندر ایک طویل داستان سموئے ہوئے ہے۔ اس افسانے میں واحد متکلم کو ایک بستی چھوڑ کر دوسری اور دوسری چھوڑ کر تیسری بستی میں جانا پڑتا ہے۔ یہ کردار نئی بستی میں قدم جما کر اپنی پہچان بنانا چاہتا ہے مگر ناکام رہتا ہے۔

میرا کوئی گھر نہیں ہے .... میرے لیے دونوں بستیوں کے دروازے بند ہو چکے ہیں۔ میری اولین خواہش یہی ہے کہ میرے جسم سے اس نئی دھرتی کی خوشبو آنے لگے۔(۳۷)

اس کے علاوہ سقوط ڈھاکہ کے المیے پر لکھے گئے افسانوں میں شناخت، امید، اب جاگتے رہنا۔ سرحدیں، تشنگی، ناگفتی وغیرہ جیسے افسانے شامل ہیں۔ ان دونوں جنگوں نے جس طرح پاکستان کو مسائل سے دو چار کیا اس کے اثرات آج بھی دیکھے جا سکتے ہیں آج بھی ہمارا ملک ان تہذیبی، لسانی، نفرت منافقت اور فرقہ بندیوں جیسے مسائل سے باہر نہیں نکل سکا بلکہ گزرتے وقت کے ساتھ ساتھ ان مسائل نے بڑھ کر ملک کی بنیادوں کو بھی کھوکھلا کر دیا ہے ا ور آج بھی ہمارا ادیب ایسے کئی مسائل سے متاثر ہو کرادب تخلیق کر رہا ہے اور اپنے ملک کی تاریخ رقم کر رہا ہے۔

حوالہ جات

۱۔ فرمان فتح پوری، ڈاکٹر، اردو افسانہ اور افسانہ نگار، اردو اکیڈمی سندھ، کراچی طبع اول، ۱۹۸۰ء، ص ۶۳

۲۔ رشید امجد، ڈاکٹر، شاعری کی سیاسی و فکری روایت، ص ۴۲

۳۔ افتخار اجمل شاہین، پروفیسر، اردو افسانے پر ایک نظر، مشمولہ نیا اردو افسانہ، ص ۳۸۲

۴۔ حسین اظہر غلام، اردو افسانہ پاکستان میں، اوراق افسانہ وانشائیہ نمبر ۲، مارچ اپریل لاہور، ۱۹۷۲ء، ص ۵۱۔ ۵۲

۵۔ ثقلین نقوی غلام، سبز پوش، مشمولہ نغمہ و آگ، مکتبۂ عالیہ لاہور، ۱۹۷۲ء، ص ۹۲

۶۔ ایضاً، ص ۴۶

۷۔ خدیجہ مستور، ٹھنڈا میٹھا پانی، مطبوعات لاہور، ۱۹۸۱ء، ص ۱۳۳

۸۔ ایضاً، ص ۱۳۷

۹۔ خدیجہ مستور، ثریا، مشمولہ ٹھنڈا میٹھا پانی، ص ۷۶

۱۰۔ خدیجہ مستور، راستہ، مشمولہ ٹھنڈا میٹھا پانی، ص ۳۸

۱۱۔ مسعود مفتی، سپاہی، مشمولہ رگ وسنگ، اقراء اسلام آباد، تیسرا ایڈیشن، ۱۹۷۸ء، ص ۱۷۔ ۱۸

۱۲۔ مسعود مفتی، نیا آدمی، مشمولہ آگ وسنگ، ایضاً، ص ۱۲۴

۱۳۔ مسعود مفتی، سپنا، ایضاً، ص ۷۹۔ ۸۰

۱۴۔ مسعود مفتی، نیند، ایضاً، ص ۱۴۲

۱۵۔ ابراہیم جلیس، بانگلہ دیش، مشمولہ الٹی قبر، مکتبہ جلیس کراچی، ۱۹۷۸ء، ص ۱۴

۱۶۔ شہزاد منظر، یوٹوپیا، سیپ، ماہنامہ کراچی، شمارہ نمبر ۲۴، ص ۱۳۱

۱۷۔ انتظار حسین، اندھی گلی، مشمولہ شہر افسوس، سنگ میل پبلشرز لاہور، ۱۹۹۵ء، ص ۱۹۳

۱۸۔ ام عمارہ، بہ گناہی بے گناہی، مشمولہ نقش، ماہنامہ کراچی، شمارہ ۶۔ ۵، ص ۷۳

۱۹۔ قیصر قیصری، وطن کا قرض، ایوان ادبیات، کراچی، ۱۹۹۱ء، ص۱۳۸
۲۰۔ غلام محمد، ترکِ وفا، مشمولہ انگلیاں ریشم کی، نثری دائرہ پاکستان، کراچی، ۲۰۰۰ء، ص۱۷۱
۲۱۔ غلام محمد، تین مسافر، ایضاً، ص۲۱۸
۲۲۔ غلام محمد، اداسی، ایضاً، ص۴۴۔۴۳
۲۳۔ شہزاد منظر، ادب ہم کہاں جائیں گے ماں، مشمولہ ندیا کہاں ہے تیرا دیس، منظر پبلی کیشنز کراچی، ۱۹۹۰ء، ص۷۶
۲۴۔ اختر جمال، دوسری ہجرت، مشمولہ زرد پتوں کا بن، التحریر لاہور، ۱۹۸۱ء، ص۴۲
۲۵۔ اختر جمال، دوسری ہجرت، مشمولہ شہر افسوس، سنگ میل پبلی کیشنز لاہور، ۱۹۹۵ء، ص۲۰۶
۲۶۔ ام عمارہ، کس نے کس کو اپنایا، ماہنامہ فنون، لاہور، جولائی اگست ۱۹۷۳ء، ص۸۳
۲۷۔ مسعود اشعر، اپنی اپنی سچائیاں، مشمولہ سارے فسانے، سنگ میل پبلشرز لاہور، ۱۹۸۷ء، ص۳۷۵
۲۸۔ رضیہ فصیح احمد، پل، مشمولہ بارش کا آخری قطرہ، سنگ میل پبلشرز لاہور، ۱۹۸۹ء، ص۲۷۲
۲۹۔ اختر جمال، دوسری ہجرت، مشمولہ زرد پتوں کا پن، ص۱۶۰
۳۰۔ رشید امجد، ڈاکٹر، کہانی ایک زوال کی، مشمولہ گم شدہ آواز کی دستک، پورب اکادمی اسلام آباد، ۱۹۹۱ء، ص۶۷۲
۳۱۔ مسعود مفتی، کفارہ، مشمولہ ریزے، ص۱۶۲
۳۲۔ مسعود مفتی، جال، مشمولہ ریزے، ص۳۱
۳۳۔ ابراہیم جلیس، الٹی قبر، مشمولہ الٹی قبر، ص۱۴۳
۳۴۔ انتظار حسین، شہر افسوس، ص۲۱۲
۳۵۔ علی حیدر ملک، پسپائی کا آخری موڑ، سیپ، ماہنامہ کراچی، شمارہ نمبر ۲۸، ص۹۰۔۹۱
۳۶۔ مسعود اشعر، دکھ جو مٹی نے دیئے، مشمولہ سارے فسانے، سنگ میل پبلشرز لاہور، ۱۹۸۷ء، ص۳۲۷۔۳۲۶
۳۷۔ مشرف احمد، خوشبو، مشمولہ جب شہر نہیں بولتے، الباقر پبلشرز کراچی، ۱۹۸۴ء، ص۱۲۷